ارمان نجمی (پٹنہ)

خاکہ نگاری

پروفیسر غلام جیلانی اصغر جو خود بھی ایک بے مثل خاکہ نگار اور کسی موضوع پر فی البدیہہ نکتہ آرائی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے کے الفاظ میں "میں نے آج تک خاکہ پر کوئی مقالہ نہیں لکھا۔" اسے کیریکچر بھی نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ سنجیدہ خاکہ نگار کسی پسندیدہ شخصیت کا جب خاکہ لکھتا ہے تو اس کا مقصود اس کا مذاق اڑانا نہیں ہوتا بلکہ اس کی خوبیوں کو ایک مختلف زاویے سے اجاگر کرتا ہوتا ہے۔ وہ اپنے ممدوح کی کمزوریوں کو بشری کمزوریاں یا مجبوریاں سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے یا اپنی کمزوریوں میں شخصیت کی توانائی کا عنصر تلاش کر لیتا ہے۔ جو خاکہ اس کے کسی بھی پہلو کو عوام یا خواص کی دلچسپی کا مرکز بناتا ہے۔ وہ خاکہ میرے لیے ایک ناکام کاوش ہے۔ رسالہ نقوش کے مدیر محمد طفیل (مرحوم) نے دو تین مجموعے اپنے خاکے کے چھاپے تھے ان سے قربت کا احساس تو ہوتا ہے لیکن شخصیت کی سرگرمی کا اندازہ نہیں ہوتا۔

خاکہ اپنے موضوع کی خامیاں تلاش نہیں کرتا بلکہ صرف ان پہلوؤں کو (Exaggerrate) بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے جو اس شخصیت سے ناواقفیت کے باوجود محبت پیدا کر دیتا ہے ۔۔۔۔۔۔ خاکہ میں بایوگرافی کے صرف نمایاں واقعہ کا سرسری ساذکر ہو سکتا ہے لیکن ان واقعات کو ہائی لائیٹ نہیں کرنا چاہئے۔ خاکہ میں ہاتھ لگا کر بھاگ جانے (ٹچ اینڈ رن) کا سا انداز ہونا چاہئے۔ آپ نے اختصار سے جن حضرات کا ذکر کیا ہے ان میں اتنا خلوص و محبت ہے کہ وہ ستائش کے زمرے میں نہیں آتے۔" رسالہ 'تخلیق' میں میں نے آپ کے ایسے چند مرحوم دوستوں کے خاکے پڑھے، انھیں تکنیکی طور پر خاکہ نہیں کہا جا سکتا ۔۔۔۔۔۔ ایک بات اور یاد رکھئے خاکہ اس پر لکھنا چاہیے جس سے نفرت یا مبارزت کا شائبہ نہ ہو" (سات مئی ۲۰۰۷ء کے خط سے اقتباس از غلام جیلانی اصغر بنام انور سدید)

پاکستانی ادب ۔ شناخت کی نصف صدی کے ۔ کے مولف پروفیسر غفور شاہ قاسم ایک نو وارد نقاد، لیکن مستقبل کے مشعل بردار نے ایک طویل رائے لکھی ہے۔ اس کے کچھ اقتباسات دیکھیے" ۔۔۔۔۔۔۔ ہر لحہ تغیر پذیر انسان کا خاکہ لکھنا اور ہر زاویے سے مکمل شخصیت نامہ لکھ لینا قطعاً آسان نہیں ہے۔ خاکہ نگاری اگر چہ پیکر تراشی، چہرہ نمائی اور حلیہ نگاری بھی ہے لیکن دراصل کردار نویسی کا عمل بھی ہے۔ میرے نزدیک یہ

شیشہ سازی کا فن ہے۔۔۔۔۔۔خاکہ نگاری میں عیب جوئی اور عیب پوشی، ہجو اور قصیدہ مدح وقدح سے ماورا ہو کر غیر جذباتی اور متوازن انداز میں زیرِ بحث شخصیت کو کھولنا اور باطنی پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ یہ زیادہ مشکل مرحلہ ہے جو کردار نویسی کا ہے، خاکہ نگار کی زیرِ بحث سے تعلق اور ذہنی قربت جس اعلیٰ سطح کی ہوگی میرے خیال میں اتنا ہی اچھا خاکہ لکھا جائے گا۔ نفسیات دانوں کے نزدیک انسانی شخصیت ایک وسیع اور تاریک بحرِ اعظم سے کم نہیں۔ اس کی سیاحت اور کھوج ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہیں۔

زیرِ بحث شخصیت کا عمومی رویہ رشتے داروں، دوستوں اور اجنبی لوگوں سے طرزِ عمل کیسا ان کا مزاج اور افتادِ طبع کیسی ہے؟۔ وعدوں پر قائم رہتا ہے یا نہیں وعدہ شکن ہے جھوٹ بولتا ہے یا ہر وقت سچی بات کرتا ہے یا مصلحت اندیش ہے یا ہر قسم کی مصلحت سے ماورا ہے۔ عملیت یا حقیقت پسند ہے یا محض تخیلاتی ہے۔ ہم سایوں اور اپنے رفقاء کار کے ساتھ اس کا تعلق کس نوعیت کا ہے۔۔۔۔۔۔۔جب تک زیرِ تالیف شخصیت کے اندرونی منطقوں اور باطنی طول وعرض ذات تک رسائی اور اس کی تفہیم نہیں ہوگی اچھا خاکہ نا لکھا جا سکے گا ۔۔۔۔۔ایک لمبے عرصے تک شخصیت کو اپنی نظر میں رکھنا ایک اچھا خاکہ نگار کے لیے لازم ہے۔۔۔۔کردار نگاری ایک مشکل کام ہے" علی عباس حسینی نے اسے سوانح نگاری کی مشکل ترین قسم شمار کیا ہے۔ وزیر آغا نے اس فن کو 'کارگہہ شیشہ گراں' کا عنوان دیا ہے اور محمد طفیل نے خاکہ نگاری کو ایسی تلوار کہا ہے جس سے خود لکھنے والا بھی زخمی ہو جاتا ہے۔ (ماہنامہ: صریر، کراچی، جون جولائی ۲۰۰۲ء، مدیر فہیم اعظمی، ص ۴۴۸)

گرچہ مندرجہ بالا تفصیلی جائزہ نگاری خاکہ کی بوطیقا نہیں ہے لیکن اس میں بوطیقا کے مضمرات موجود ہیں۔ خاکہ نگاری اور یادنگاری کو آپس میں مدغم نہیں کرنا چاہیے۔ یہاں محسوسات سے گریز اختیار نہیں کرنا چاہیے اور کرداروں کی چھوٹی چھوٹی قوسوں کو نمایاں کرنا چاہیے شخصیت کے بارے میں مخصوص تاثر ابھارنے میں خاکہ نگار کا عمل اور ردِ عمل معاونت کرتا ہے۔ اردو میں خاکوں کے ابتدائی نمونے تذکروں سے تلاش کیے جا سکتے ہیں اور ناولوں کے کرداروں سے بھی۔ اس سلسلے میں دلی سے عائشہ طلعت خلجی کی کتاب 'خاکہ نگاری کی تنقید' اور صابرہ سعید کی کتاب 'خاکہ نگاری کی ابتداء اور ارتقاء' جو حال ہی میں شائع ہوئی ہیں۔ لیکن اہلِ نظر محمد حسین آزاد کے (آبِ حیات) کے قلمی مرقع سے ہی اس کی ابتدا تسلیم کرتے ہیں اور فرحت اللہ بیگ کی 'ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی' کو اس کا اولین نمونہ مانتے ہیں کہ ان کی خوبیاں اور خامیاں بھی متوازن طریقے سے پیش ہوئی ہیں مولوی عبدالحق کا "چند ہم عصر" اس سلسلے کی دوسری اہم کتاب ہے جس میں حالی، اقبال، محسن الملک اور رام دیو جیسے عام انسان کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک، اشرف صبوحی اور شوکت تھانوی اس ہراول دستے میں شامل ہیں جنھوں نے خاکوں کی شناخت قائم کی عصمت

چغتائی کی 'دوزخی' اور حمیدہ سالم کا 'مجاز میرا بھائی' کو بھی اسی زمرے میں شامل کرنا چاہیے۔

سچائی یہی ہے کہ خاکہ ایک جدید نثری صنف ہے جو بیسویں صدی خاص کر اس کے آخری پانچ چھ دہائیوں میں زیادہ تکمیل یافتہ شکل میں سامنے آئی۔ سلیم احمد صاحب ایک نابغۂ روزگار تھے جن کے تعلقات اپنے بزرگوں سے بھی ہم عصروں سے بھی اور عزیزوں سے بھی تھے۔ اسد محمد خان نے ان پر ایک یادگار خاکہ لکھا ہے۔

حمید نسیم کے انتقال پر مبین مرزا نے اپنے موقر جریدہ 'مکالمہ' میں بہ عنوان 'وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر' لکھا ہے اور مجھے اس لیے پسند ہے کہ گرچہ اس میں حمید نسیم کی زندگی کے آخری دور کے ملاقاتوں سے بیانیہ میں جان ڈالی گئی ہے۔ پھر بھی ان کی کتابوں سے ان کو دریافت نہیں کیا ہے بلکہ دید و شنید اور اپنے مشاہدے سے بھی کام لیا ہے۔ میں حمید نسیم کی علمی حیثیت کا قائل ہوں۔ میرے کیسے میں صرف ان کی ایک ملاقات کا خزانہ ہے۔ میں اس لکھے کو پڑھ کر سر دھنتا رہا ہوں اس دور کے کئی تجا کے ابھی میرے حافظے سے محو نہیں ہوئے ہیں۔ سلام مچھلی شہری ایک بہت ہی مشہور شاعر ہیں جن کے ساتھ قاریوں نے انصاف نہیں کیا۔ وہ ترقی پسند کے عروج دور میں بھی کیٹس، شیلی، ورڈس ورڈتھ جیسے رومانی اور لارڈ ٹینیسن کے شعری تصورات کو فروغ دے رہا تھا۔ کنول نین پرواز کے خاکے پر انور سدید کی رائے ملاحظہ کیجیے۔ یہ ایک ایسے شاعر کا خاکہ ہے جسے اپنی صلاحیتوں کا پورا ادراک تھا لیکن جو اپنی ناکامیوں سے بے خبر بھی نہیں تھا۔ سلام مچھلی شہری خود کو آزاد نظم کے بانیوں میں شمار کرتے تھے لیکن افسوس کا اظہار کرتے کہ جب آزاد نظم کے حوالے سے اس کے بانیوں میں ان دونوں شعرا (میراجی اور ن۔م۔راشد) کا نام لیا جاتا ہے تو سلام مچھلی شہری کو نقاد نظر انداز کر دیتے ہیں۔ نقادوں کے اس رویے پر وہ اپنی ناراضی سے جو زہرخند پیدا ہوتا ہے وہ یوں ہے۔ن۔م۔راشد نے اپنی ایک نظم میں ایک فرنگی عورت کے جنسی اختلاط کرنے کے بعد شاید ملک کی غلامی اور غربت کا جیسے بدلا لے لیا۔ اور میراجی یہ سوچتے ہیں کہ اپنے کندھے سے لٹکتے ہوئے جھولے میں تین آہنی گولے ڈال کر جیسے کائنات کو ان میں سمیٹ لیا ہے۔۔۔۔۔۔ میں تو بس اپنی ویسی ہی شاعری کو سرمایہ سمجھتا ہوں۔ دنیا کو، اور گھر والوں کو دینے کے لیے میرے پاس یہی کچھ رہ گیا ہے۔"

انور سدید مزید لکھتے ہیں کنول نین پرواز نے اس خاکے میں شخصیت نگاری اور تنقید کی حدیں آپس میں ملا دی ہیں اور یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ سلام مچھلی شہری کو اپنی ملاقاتوں اور ان کی نظموں سے دریافت کرنے کی کوشش کی ہے جو کامیاب نظر آتی ہے۔ رفعت سروش نے 'دلی جو ایک شہر تھا' میں سلام کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس پر انور سدید کی نظر نہیں پڑی۔

کچھ ایسے خاکوں کا بھی ذکر کردوں جس میں موضوع یوں تو ان شاعروں کی ذات ہے لیکن بیان کا زاویہ ان کی مے نوشی اور نشے میں ڈوبے رہنے کی لت سے نکالا گیا ہے۔ جاں نثار اختر کا جو خاکہ بعنوان 'ایک جوان موت' جو ندا فاضلی نے لکھا ہے اس میں اپنے مطالعہ اور مشاہدہ کا جوہر اس فقرے میں سمو دیا ہے۔ 'دولت مند اسی کو دوست مانتا ہے جو اپنا نام بھلائے رکھنے کی شرافت جانتا ہو' دراصل اس میں ساحر لدھیانوی جیسے رند بلا نوش کا تذکرہ ہے جس کو اپنے بارے میں بولنے کا شوق مرض کی حد تک بڑھا ہوا تھا۔ شاید وہ (Megalomania) کا مریض تھا اسے ہر وقت خاموش سننے والے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ ساحر لدھیانوی پر خاکہ میں ندا فاضلی نے یہ بھی لکھا ہے "دوستوں کو گالیوں سے نوازنا ان کا محبوب مشغلہ تھا اس مشغلہ کا شکار ہونے والوں میں علی سردار جعفری، کرشن چندر، مجروح سلطان پوری اور کیفی اعظمی سب شامل تھے۔ ساحر نے اس کارِ نیک کے لیے کچھ دنوں پرکاش پنڈت کو بھی اپنے ساتھ رکھا تھا۔ ساحر اپنی گالیوں سے جس سماجی مجبوری سے نوازنے سے گریز کرتے تھے ایسے آڑے وقت میں پرکاش پنڈت ان کے کام آتے اور ساحر کا اشارہ پاتے ہی پنجابی مغلظات کے ساتھ کسی سے بھی لپٹ جاتے۔"

کرشن ادیب نے غرقِ مے نایاب شاعر پریم وار برٹنی جیسے نظم کہتے نکے شاعر کی فطرت کا مطالعہ اس کی شراب نوشی سے کیا اور اس کی شخصیت کا نقش اپنی یادوں سے مرتب کیا۔ "ایک مرتبہ میں اور پریم ایک دیسی شراب خانے میں بیٹھے پی رہے تھے حسب معمول پریم نے تیسرا پیگ پینے کے بعد مجھ سے کہا کہ کرشن کیا تم کو خود کو شاعر سمجھتے ہو؟ ہاں میں نے جواب دیا کیا تمھیں شک ہے؟ پریم وار برٹنی بولا اگر تم شاعر ہو تو نہایت گھٹیا قسم کے شاعر ہو۔۔۔۔۔قطعاً۔۔۔۔ہو" کرشن ادیب نے ہنستے ہوئے جواب دیا یار پریم وار برٹنی تم بھی کمال کرتے ہو شراب پی کر سچ نہیں بولا کرتے یہ باتیں ہم صبح کریں گے۔۔۔۔۔"

اب کچھ ایسے خاکوں کا ذکر کردوں جن کے مطالعہ سے مجھے خاکے سے دلچسپی میں اضافہ ہوا غلام الثقلین نقوی کا ایک اچھا آدمی جو انشائیہ نگار جمیل آذر پر لکھا گیا ہے۔ نقوی صاحب اس خاکے میں صرف اپنے ممدوح کو ہی مرکز نگاہ نہیں بناتے بلکہ ان کے گرد و پیش بھی نظر دوڑا کر اپنے تاثرات کا داخلی صداقت سے ایسا نقش اُبھارتے ہیں جو ان کے انشائیے کی طرح خوبصورت اور ان کی ذات گرامی کا ہی عکاس ہے۔ گذر یا والے اشفاق احمد نے ایک ناول قسم کا خاکہ 'چھیلے کی موت' لکھا اور اپنی کہانی نویسی سے مخیلہ کا جادو جگایا۔ میں خاکوں کا تذکرہ ختم کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن اچھے خاکوں کے بیان سے دامن کش بھی نہیں ہونا چاہتا گزشتہ دو تین دہائیوں میں بہت اچھے خاکے لکھے گئے ہیں۔ نذر الحسن صدیقی (جو مشہور ابوالفضل صدیقی کے عزیز ہیں) نے اپنے کم عمر بیٹے کی غیر متوقع موت کے بعد لکھا۔ 'دُرِ سمیع ہمارا' پڑھ کر ایک ایسا دکھ رگ و پے

میں سرائت کر جاتا ہے جو بہت دیر تک اپنے آپ میں آنے نہیں دیتا۔عباس احمد رضوی نے رضی اختر شوق اور ممتاز رفیق نے سراج منیر کا خاکہ لکھ کر ان کی یادوں کو تازہ کیا۔جوش ملیح آبادی پر لکھا ہوا شوکت تھانوی کا ایک پرانا خاکہ فیصل عجمی اور ثمینہ راجا کے رسالے آثار میں دوبارہ ۱۹۹۸ء میں شائع کرایا جس میں جوش کی شخصیت کے کئی نادر گوشے سامنے آئے۔

پرنسپل غلام جیلانی اصغر نے کہیں لکھا ہے کہ کچھ کردار ایسے تابناک ہوتے ہیں جن پر خاکہ لکھا ہی نہیں جا سکتا۔اس قسم کے کرداروں میں انھوں نے احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا کا نام خصوصی طور پر لیا ہے۔لیکن فہمیدہ ریاض نے احمد ندیم قاسمی کا خاکہ لکھ کر ثابت کر دیا کہ وفا شعار جانب داری اور اندھی عقیدت کے حصار سے نکل کر لیکن معصوم نگاہی سے دیکھ کر ایسا خاکہ لکھا ہے جو کوئی دوسرا نہیں لکھ سکتا تھا۔کہ طویل خط و کتابت کے دوران فہمیدہ ریاض کو اپنے لڑکی ہونے کا احساس شدت سے بیدار ہوا تھا۔وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ ندیم صاحب کو وہ اپنا دوست سمجھتی ہیں، حالاں کہ وہ دونوں طبعاً ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔''بات یہ تھی کہ ندیم صاحب مجھ کو خاصا پسند کرتے تھے پتا نہیں اس کو محبت کہا جا سکتا ہے یا نہیں لیکن وہ محبت کی ایک قسم تو ہے۔سو اسی محبت میں وہ مجھے بار بار نصیحتیں کرتے جاتے تھے ہر بات کے انجام سے باخبر کرتے جاتے تھے۔اس سے مجھ کو الجھن ہوتی تھی اور زیادہ کھل کر بات کرنے میں مجھ کو جھجک محسوس ہونے لگتی تھی۔انھیں نظمیں بھیجتے ہوئے بھی مجھے ایسا لگتا تھا جیسے کسی بزرگ کے سامنے سر سے دوپٹہ اتر گیا ہو۔بارہا انھوں نے میرے لیے کاغذ اور قلم بھیجے تا کہ میں لکھتی رہوں۔لیکن ہمارے ظاہری حدود کے نیچے جو ایک دھارا سا بہتا رہتا ہے اس میں ان کو شامل کرنا میرے لیے ناممکن تھا،اپنے تخیل کے عجیب رنگ میں انھیں نہیں دکھا سکتی تھی''۔

''ندیم صاحب کے لیے میں دور دراز سندھ میں رہنے والی ایک ایسی لڑکی تھی جس سے ندیم صاحب نسبتاً آسانی سے اور زیادہ کھل کر بات کر سکتے تھے۔مکمل طور پر کھل کر بات کرنے والے تو وہ آدمی ہی نہیں ہیں ندیم صاحب جانتے ہیں کہ لوگوں سے کیسے فاصلہ قائم رکھیں۔۔۔۔میں جب بھی ان سے ملی ہوں مجھے ایسا لگا ہے کہ وہ رسیّوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔۔یہ کیسی بندشیں ہیں جو انھوں نے خود پر عائد کر رکھی ہیں۔عام انسان کا آدرشی خاکہ تو ندیم صاحب کے سامنے تو ضرور تھا لیکن اس خاکے کے مطابق اپنی تصویر بنانے کے بدلے ندیم صاحب نے خود اپنے آپ کو اس خاکے میں فٹ کر لیا ہے یعنی وہ بالکل ویسے ہی ہیں جیسے نظر آتے ہیں۔ایک بردبار متحمل، باوزن شخصیت اور ایک بہت روایتی خاکہ ہے (بعض لوگ کہتے ہیں کہ ندیم صاحب اپنا ایک بت بنایا ہے ایک ایسی تصویر جو انسان سے بھی بڑی ہے) نفرت، غصہ، حسد یا صریح جلن یہ سب انسانی جذبات تو ہیں ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ ندیم صاحب نے یہ چھوٹی انسانی خصلتیں وجود میں نہ

رکھتی ہوں مگر ندیم صاحب نے ان کا اس طرح گلا گھونٹا ہے کہ یہ جملہ انسانی اوصاف بے چارے سانس بھی نہیں لے سکتے۔ان کی شخصیت میں ہر طرف عظمت ہی عظمت نظر آتی ہے۔ندیم صاحب کی تقدیم میں عزت و احترام ہے عظمت کی بلندیوں پر وہ کھڑے ہیں۔کوچۂ ادب کے ہم جیسے خاک نشین ان کی تعظیم میں سرو قد تو کھڑے ہو سکتے ہیں مگر ندیم صاحب کبھی 'آ ادھر آ اے او چاک گریباں والے' کی بپدا بھری پکار نہیں سن پائیں گے۔یہ خاکہ جذباتی قربت سے ذہنی مفارقت تک کا آئینہ دار ہے لیکن فہمیدہ ریاض نے ندیم شناسی میں اپنے احساس اور قلم پر جذباتیت طاری نہیں ہونے دی اور حقیقی ندیم کو دریافت کرنے کی عمدہ کاوش کی ہے۔قاسمی صاحب پر اس سے قبل ایک حقیقت افروز خاکہ نیرنگِ خیال کے سال نامے میں حفیظ احسن لکھ چکے ہیں جس میں عقیدت کے آبگینے کو قائم رکھتے ہوئے حقیقت کے چند کھردرے نقوش اُبھارے گئے تھے فہمیدہ ریاض کا یہ خاکہ ندیم صاحب کے زندگی کے متعدد ایسے زاویے سامنے لاتا ہے جیسے ان کا کوئی ایسا عقیدت مند ہی لکھ سکتا ہے جس نے ندیم صاحب کا مطالعہ بہت قریب سے کیا ہو۔دراصل فہمیدہ ریاض نے احمد ندیم قاسمی کو اس معصوم نظر سے دیکھا جو بلوغت کی پہلی کرن سے بے دار ہو جاتی ہے اور اس مدیر سے جو اولمپیا پہاڑ پر بسنے والے دیوتاؤں کی طرح تھے یہ دریافت کیے بغیر نہ رہ سکیں کہ آپ فنون کے ٹائٹل پر اعلیٰ ادب کا پیمانہ کیوں لکھواتے ہیں۔یہ تو خالص گھی کا اشتہار معلوم ہوتا ہے۔

اعلیٰ قدروں پر جو انسان کو اشرف المخلوقات بناتی ہیں پر مادی قدریں غالب آ رہی تھیں تو اس دور میں نادر اور انوکھا انسان آبادیوں کے ہجوم میں گم ہوتا جا رہا تھا ان کو خاکہ نگاری کا موضوع بنایا گیا اور جو اس صنف میں خاص و عام اور ادیب و قاری کی دلچسپی کا باعث بنا کہ افسانوی کرداروں کے مقابلے میں خاکے کے کردار حقیقی ہوتے ہیں اور حقیقی شخصیت کے خدوخال کو سامنے لاتے ہیں جو بالعموم دوسرے کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔

شہزاد منظر کتابوں کے رسیا تھے اور ان پر جان دیتے تھے ان سے میری ملاقات صبا اکرام کے دولت کدے واقع ندیم کارنر میں ہوئی تو کتابوں پر جب ان سے باتیں ہونے لگیں تو علی حیدر ملک نے ٹوکا کہ ڈاکٹر! کتابوں کے علاوہ یہاں ہم لوگ بھی موجود ہیں شہزاد منظر کی کتاب 'پاکستان میں ترقی پسند تنقید کے پچاس سال' ان کا زبردست کارنامہ ہے۔روشنائی کے مدیر احمد زین الدین نے ان پر جو خاکہ لکھا ہے وہ مجھے بہت پسند ہے کہ اس کے ہر لفظ میں محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔امجد اسلام امجد پر راولپنڈی کا رسالہ چہار سو میں کئی خاکے شامل ہیں۔لیکن مجتبیٰ حسین کا خاکہ لاجواب ہے۔مشہور ناقد مجتبیٰ حسین (جن پر اسلم فرخی کا خاکہ بہت ہی کامیاب سمجھا جاتا ہے) نے فراق گورکھ پوری کے عنوان سے جو خاکہ لکھا ہے جو ان کی خاص

کمزوری تھی یعنی گالی دے کر یا جملے بازی کر کے دوسروں کی تضحیک سے اپنی انا کو تسکین دیتے تھے۔ پروفیسر ڈاکٹر گیان چند نے مامون ایمن کا خاکہ بڑی محبت سے لکھا'' مجھے دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ مامون ایمن صحیح معنوں میں سفید پوش ہیں سفید رنگ، سفید قمیض سفید پتلون اور سفید جراب اور سفید جوتے۔ امریکہ میں سفید پتلون نوارد ہوتی ہے۔ ان کا مختصر تعارف یہ ہے کہ وہ پنجابی بولتے ہیں اردو لکھتے ہیں اور انگریزی پڑھاتے ہیں۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ سوچتے کس زبان میں ہیں۔ زینت ساجدہ کا ایک خاکہ مخدوم محی الدین پر رسالہ گجر (۱۹۵۷ء) میں چھپا تھا اور ان کا یہ کہنا کہ مخدوم صاحب نے اپنی عمر کا الٹا چکر چلا رکھا ہے اور دن بہ دن ان کی عمر گھٹتی جا رہی ہے ابھی تک مجھے مزہ دیتا ہے۔

ہندستان میں اچھے خاکے لکھے جا رہے ہیں اور خاکہ نگاری پر کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں 'خاکہ نگاری کی ابتدا اور ارتقا' صابرہ سعید اور 'اردو میں خاکہ نگاری کی تنقید' عائشہ طلعت خلیجی، کا نام لیا جا سکتا ہے خاکوں کے جو مجموعے مقبول ہو چکے ہیں ان میں چند یہ ہیں' عابد سہیل کی 'کھلی کتاب' عوض سعید کے 'خاکے' اور مجتبیٰ حسین کا 'سو ہے وہ بھی آدمی' اور 'سوندھی مٹی کے بت' خالد سید خالد قادری کے عالم خوند میری، شاذ تمکنت ،مغنی تبسم، شہریار و دیگر ادیبوں پر خاکے سب رس میں شائع ہو چکے ہیں اقبال متین نے بھی کچھ قابلِ ذکر خاکے رقم کیے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ صغریٰ مہدی نے کئی خاکے لکھے ہیں جن میں ' آپا جان' مجھے ابھی تک یاد ہے۔ ان دنوں جاوید صدیقی کے خاکوں کی دو کتابیں 'روشن دان' اور 'لنگر خانہ' مقبول ہو چکی ہیں سلام بن رزاق کے 'تذکرے' میں خاکوں کے ساتھ یادنگاری کے عناصر بھی شامل ہیں مشہور افسانہ نگار غضنفر کی دو کتابیں 'سرخرو' اور 'خوش رنگ' کا سرسری ذکر ہی کر رہا ہوں کہ ان میں مشمولہ خاکے الگ مضمون کے متقاضی ہیں۔ □□□

تبرکاتِ فرحت

اس دور کی تعلیم کا معیار عجب ہے
تعلیم تو آتی ہے جہالت نہیں جاتی

□□□□

نہ جھیل پاؤ گے فرحت جہالتوں کا عذاب
پڑھے لکھوں سے ذرا دور ہی رہا کرنا

خلیل فرحت کارنجوی (مرحوم)

جلد نمبر ۸ | شمارہ نمبر ۲ | امراوتی، مہاراشٹر (ہند) | اپریل تا جون ۲۰۱۹ء

سرپرست : جناب منور پیر بھائی (پونہ)

مدیر

وسیم فرحتؔ (علیگ)

Email:wkfarhat@gmail.com Cell.09370222321/07020484735

نائب مدیران: کلیم ضیاؔ، احسن ایوبی

مشیر

شمیم فرحتؔ

شمارۂ ہٰذا	۱۰۰ روپے
لائبریری اور اداروں سے	۲۵۰ روپے
لائف ممبرشپ	۵۰۰۰ روپے

For Online Payments:
SEAMAHEE URDU
SBI ACCOUNT NO:
34961340420
IFS CODE:SBIN0000311
MICR CODE: 444002971

خط و کتابت کے لیے:
Waseem Farhat (Alig)
Post Box No.55, H. O,
AMRAVATI-444601(M.S)INDIA

صرف زرِ سالانہ اور رجسٹری ڈاک کے لیے:
The Editor,URDU,
"Adabistan", Near Wahed Khan
UrduD.Ed.College, Walgaon Road,
AMRAVATI-444601,Maharashtra (India)

پاکستانی خریداروں کا صرف زرِ سالانہ بھجوانے کیلیے:
بزمِ تخلیقِ ادب پاکستان
B/18-II، کمرشل ایریا نزد ہیرا ایشیا بیکری، ناظم آباد، کراچی
موبائل:0321-8291908

اگر آپ چیک یا ڈرافٹ بھیجنا چاہیں تو صرف **SEAMAHEE URDU** اس نام سے بھیجیں۔